سعود الحسن خان روہیلہ

ریسرچ اسکالر

جینڈر اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

سرسیّد احمد خان اور مراد آباد

ABSTRACT

Sir Syed Ahmed Khan and Muradabad

By Saud-ul-Hasan Khan Rohaila, Research Scholar, Department of Gender Studies, Punjab University, Lahore.

Every aspect of Sir Syed Ahmed Khan's life has been attracting attention of the scholars.In addition to Delhi, where he was born and brought up, Sir Syed stayed in different cities for certain time for certain reasons. But some cities have a special status in Sir Syed's life and Muradabad is one of them.

This paper surveys and analyses Sir Syed's connection to Muradabad from different aspects.

سرسید احمد خان مرحوم نے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور سماجی ترقی کے لیے جو کچھ کیا اسے ان کے اپنے دور میں بہت ہدفِ تنقید بنایا گیا لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ جوان کی سوچ تھی وہ درست تھی اور آج ہم لوگ انھی کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ سرسید احمد خان کام کے دھنی تھے اور مخالفین کی تنقید کی کم ہی پرواہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی تحریروں میں تحقیق زیادہ اور مناظرے کم نظر آتے ہیں۔ سرسید نے سب سے زیادہ کام علی گڑھ میں کیا ہے اور پھر مراد آباد میں۔ مراد آباد، شمالی ہندوستان کا مشہور شہر ہے اور کسی زمانے میں علم وادب کا بڑا مشہور مرکز رہا ہے۔ سرسید یہاں پر صدرالصدور مقرر ہو کر آئے تھے۔ آپ نے یہاں ۳ سال کام کیا اور در حقیقت سب سے زیادہ تحقیقی کام یہیں بیٹھ کر کیا تھا۔

دراصل سرسید کو احمد خان کو مراد آباد سے تعلق خاص تھا۔ جس کی بنیای وجہ غالباً یہ تھی کہ مراد آبا میں ان کی سسرال تھی۔ الطاف حسین حالی نے حیات جاوید میں اور سرسید نے اپنی تحریروں میں اس بات کا حوالہ کہیں نہیں دیا کہ سرسید کی بیوی کا نام اور خاندان کیا تھا۔ مراد آباد میں ثقہ حضرت کی روایت ہے کہ سرسید احمد خان کی شادی قاضی شوکت حسین کے خاندان میں کسی لڑکی سے ہوئی۔ ان کی بیگم کا پورا خاندان شوکت باغ میں آباد ہے۔ سرسید احمد خان ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۲ء تک مراد آباد

میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی دوران ۱۸۶۱ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ سر سید کی اہلیہ شوکت باغ کے ایک احاطے میں خاندانی قبرستان میں دفن ہیں۔ سر سید کو ان کی وفات کے سخت صدمہ ہوا۔ انھوں نے بعد ازاں دوسری شادی میں بھی نہیں کی حالاں کہ اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ سر سید کی بیگم اور خوش دامن یعنی ساس کی قبور کے عین تین طرف مکانات بنے ہوئے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ حصہ بھی نوتعمیر شدہ مکانات میں آ گیا تھا۔ بعد ازاں اہالیان مراد آباد نے اس کا بندوبست کیا اور اسکے چاروں جانب جنگلہ لگا دیا تا کہ یہ نشانیاں محفوظ رہیں۔ راقم نے ۲۰۰۴ء اور ۲۰۱۰ء میں ان قبور پر فاتحہ پڑھی اور ان کا فوٹو بھی لیا جو اس تحریر کے ساتھ لف ہے۔

سر سید احمد خان اپریل ۱۸۵۸ء کو بجنور سے ترقی پا کر مراد آباد آ گئے۔ یہاں وہ صدر الصدور تھے جو کہ ایک اہم عہدہ تھا۔ سر سید غالباً شہزادہ فیروز شاہ کی یورش مراد آباد کے بعد مراد آباد پہنچے تھے کیوں کہ فیروز شاہ کی جنگ کے دوران ان کی شرکت کا کہیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مراد آباد میں سر سید احمد خان نے صدر الصدوری کے فرائض سرانجام دیئے اور چوں کہ ان کا تعلق انگریزی کے حامی گروہ سے تھا لہٰذا انقلابیوں کو مختلف سزائیں دینے میں ان کی حصہ داری بھی تھی۔ اس بات کی تصدیق حیات جاوید سے بھی ہوتی ہے۔

> اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائیداد فیصلہ کے متعلق عذر داریاں ہونے لگیں اور ان کی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بیٹھا۔ اس میں دو یورپین ممبر، ایک کمشنر روہیل کھنڈ، دوسرے جج مراد آباد اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سر سید مقرر ہوئے۔ چناں چہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔[۱]

اس کمیشن کی کاروائی کے حوالے سے سر سید کے اپنے بیانات میں کچھ نہیں پتا چلتا۔ اگرچہ مراد آباد میں کافی جائیدادیں واگزاشت ہوگئیں تھیں لیکن ایسا صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوا کہ جو انگریزوں کے ہمدرد تھے یا پھر غیر جانبدار تھے مگر محض شبہ میں جن کی جائیدادیں ضبط ہوگئیں تھی۔ سر سید احمد خان نے مراد آباد کے ایسے ہی لوگوں کی مدد کی۔ چناں چہ مراد آباد کے مولانا عالم علی کو انھوں نے بری کروا دیا۔ مولانا عالم علی مراد آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت سی یورپی انگریز عورتوں، بچوں اور مردوں کو چھپا رکھا تھا۔ جب جنرل بخت خان مراد آباد آئے تو لوگوں نے ان انگریزیوں کو مولانا کے گھر میں گھس کر پکڑ لیا۔ آگے ان کے مستقبل کے بارے میں اختلاف ہے۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ انھیں نواب رام پور کے پاس بھیج دیا گیا۔[۲] حالی کا بیان ہے کہ ان سب کو قتل کر دیا گیا تھا۔[۳] بہرحال مولوی عالم علی جنگ کے بعد اس خوف سے روپوش ہو گئے کہ کہیں ان کے قتل یا گرفتاری کا الزام ان کے سر نہ پڑ جائے اور اندھی پکڑ دھکڑ میں وہ مارے جائیں۔ لہٰذا وہ روپوش ہو گئے۔ سر سید احمد خان کو علم تھا کہ وہ بے قصور ہیں اور دراصل انگریزوں کے خیر خواہ ہیں لہٰذا مولوی عالم علی کو انگریزوں سے بات طے کر کے عدالت میں پیش کرایا اور ضابطے کی کاروائی مکمل کر کے ان کو بری کرا دیا۔

سرسید احمد خان نے اپنی تحریر میں انقلابیوں کے حوالے سے جو القابات (بدمعاش، جاہل، نمک حرام وغیرہ) استعمال کیے ہیں ان کو اگر مذکورہ بالا واقعے میں ملا کر پڑھا جائے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید نے اپنے اختیارات سے صرف ان مرادآبادیوں کو فائدہ دلوایا جو دراصل انگریزوں کے خیرخواہ تھے اور محض شبہ میں پکڑے گئے تھے۔ حقیقی انقلابیوں مثلاً ارکان خانوادہ مجو خان، اولاد دوندے خان، اہل خانہ سید گلزار علی، مولوی کفایت علی کافی، رفیع علی خان، مولوی وہاج الدین خان، نیاز علی ڈپٹی کلکٹر وغیرہ ان کے حوالے سے سرسید احمد خان نے کوئی ہمدردی نہیں کی اور ان لوگوں سے وابستہ بے گناہوں کی سزاؤں کی کمی یا ضبط شدہ جائیداد کی واگذاشت کے لیے کچھ نہ کیا۔ ان کے حوالے سے سرسید نے صرف تحریروں میں لفظی ماتم کا اظہار کیا:

> آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کو بہادری کا تھا، اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ (۴)

البتہ مرادآباد میں سرسید احمد خان کو یک گونہ سکون ہو گیا۔ اب وہ اپنی توجہ تصنیف و تالیف کی جانب بھرپور دے سکتے تھے۔

سب سے پہلے تصنیف جو مرادآباد آ کر سرسید نے کی وہ تاریخ سرکشی ضلع بجنور ہے۔ چوں کہ تمام واقعات ذہن میں تازہ تھے اور دستاویزات تک ان کی رسائی میں تھیں لہٰذا انھوں نے اس تاریخ کو مرتب و تصنیف کیا۔ اصل دستاویزات بھی نقل کیں۔ یہ تاریخی حوالے سے بہت اہم تصنیف ہے۔ اگرچہ اس میں انقلابیوں کو جی بھر کر کوسا گیا ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب آج بھی ۱۸۵۷ء پر ہونے والے کاموں کے بنیادی مآخذات میں سے ایک ہے۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک ضلع بجنور میں جنگ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں تحریر کی گئی اور ۱۸۵۹ء میں مرادآباد سے ہی شائع کروائی گئی۔

مرادآباد میں ہی ایک دوسری کتاب سرسید احمد خان نے 'رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان' تحریر کی۔ اس میں جنگ ۱۸۵۷ء کے اسباب کا جائزہ لیا گیا اور زیادہ الزام جنگ کا انگریزوں پر ڈالا گیا۔ اس حوالے سے سرسید نے کافی حقیقت پسندی سے کام لیا۔ لیکن یہ کتاب ۵۰۰ کی تعداد میں شائع کی۔ ماسٹر رام چندر کے برادر خورد رائے شنکر داس جو اس وقت مرادآباد میں منصف تھے اور سرسید کے خاصے اچھے دوست تھے انھوں نے ان کو یہ کتاب تلف کرنے کا مشورہ دیا مگر سرسید نے انکار کر دیا۔ البتہ یہ کتاب ہندوستان میں بالکل تقسیم نہ کی۔ اس کی کچھ کاپیاں خود رکھیں، ایک کاپی گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجی اور باقی تمام کاپیاں حکومت برطانیہ کو لندن روانہ کر دیں۔

انگریزوں کی غلطیوں کی نشاندہی خود انگریز بھی اس دور میں کر دیا کرتا تھے مثلاً بدایوں کے مجسٹریٹ مسٹر ایڈورڈس

نے بھی انگریزوں کی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ البتہ اس طرح کی کتب کبھی عوام کے سامنے نہیں لائیں گیں۔ خود سرسید بھی قصداً یہ کتاب کبھی سامنے نہ لائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریز اپنی اصلاح کریں جبکہ ہندوستانیوں میں اس حوالے سے کوئی شعور اُجاگر کرنا سرسید کے مقاصد میں نہیں تھا جیسا کہ خود حالی کا بھی خیال ہے۔[(۶)]

جب نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ برطانیہ کی جانب سے عام معافی اور امن کا اعلان کیا گیا تو سرسید نے مسلمانان مراد آباد کی جانب سے اس کے شکریہ کے نام سے ایک تحریر شائع کی اور اسے شاہ بلاقی صاحب کی درگاہ کے پاس سرعام پڑھا گیا۔ یہ ۲۸/ جولائی ۱۸۵۹ء کو پڑھا گیا۔ حالی نے لکھا ہے کہ تقریباً پندرہ ہزار مسلمان اس میں جمع ہوئے۔ لیکن اس مجمع میں کثیر تعداد غریبوں اور فقرا کی تھی کیوں کہ اہالیان مراد آباد کی اکثریت انگریز نواز جلسوں سے پرہیز کرتی تھی۔ سرسید نے یہ جواب ''مناجات'' کے نام سے شائع کیا اور اس میں سامعین کو یہ باور کرایا کہ یہ ہم ہندوستانیوں کے گناہ تھے جن کی سزا ہمیں ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تباہی کی صورت میں ملی ہے۔ انگریزوں کو نہایت عادل اور منصف قرار دیا گیا۔

اس کے بعد سرسید احمد خان نے مراد آباد میں ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے نام سے رسائل کا سلسلہ شروع کیا لیکن مسلمانوں کی عدم توجہی کے باعث تین رسائل سے زائد رسالے شائع نہ ہو سکے۔ ان رسائل میں سرسید احمد خان نے ان مسلمان حضرات کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ جنھوں نے انگریزوں کی خدمات سرانجام دیں اور بعض نے تو اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ انگریزی تصانیف میں جنگ ۱۸۵۷ء کے تمام الزام مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کے بارے میں ہمیں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ انھوں نے تمام مسلمانوں کو اس الزام سے بری کرنے کی کوشش کی حالاں کہ اگر ان رسائل کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے جاں نثار موجود تھے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس اوپر درج کر دیا گیا ہے (حالی ۱۰۱۔۱۰۷)۔ یہ کتاب یا رسالے ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئے۔

اسی دوران سرسید نے ''تحقیق لفظ نصاریٰ'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں انگریزوں کو یہ باور کرایا کہ نصاریٰ کوئی توہین آمیز لفظ نہیں ہے۔ جب کہ عربی میں عیسائیوں کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔ یہ کام انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک غلط فہمی کی ختم کرنے کی غرض سے کیا گیا اور بلاشبہ یہ ایک اچھا کام تھا اور علمی نوعیت کا تھا۔ مراد آباد میں ہی سرسید نے ضیاء الدین برنی کی مشہور تصنیف ''تاریخِ فیروز شاہی'' کی تصحیح کی۔ یہ بھی ان کا ایک علمی کارنامہ ہے کہ انھوں نے کئی نسخے مدنظر رکھ کر اس کتاب کو درست کیا اور ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کے بعد سرسید احمد خان نے ''تبیین الکلام'' کے نام سے بائبل کی تفسیر لکھی۔ اس غرض سے انھوں نے غازی پور میں ایک یہودی شخص سالم سے عبرانی بھی سیکھی۔ اگرچہ یہ ایک طویل کام تھا لیکن اس کا آغاز سرسید نے مراد آباد سے ہی کیا۔

مراد آباد میں ہی مرزا غالب کی مہمانداری کا اعزاز سرسید کو ملا۔ دراصل مرزا غالب رام پور سے واپس دہلی جا رہے

تھے اور سرائے پختہ میں قیام پذیر تھے کہ سرسید احمد خان کو جو پتا چلا تو وہ سابقہ ناراضگی نظر انداز کر کے فوراً سرائے پہنچے اور مرزا جی کو سامان سمیت اپنی قیام گاہ پر لے آئے۔ اس حوالے سے ''حیاتِ غالب'' اور ''مکاتیبِ غالب'' وغیرہ میں بہت کچھ درج ہے لہٰذا میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ سرسید مرزا جی کو اپنے شوکت باغ والی قیام گاہ پر لے گئے اور باغ کے صدر دروازے پر جو دو کوٹھریاں ہیں، ان میں مرزا جی نے قیام کیا۔ یہ کوٹھریاں خستہ حالت میں ۲۰۱۰ء تک میں نے خود مشاہدہ کی تھیں اور مراد آباد کی ایک معتبر شخصیت ماسٹر عتیق صاحب (جنت نشان اسکول، مراد آباد) نے اس جگہ کی نشاندہی کی تھی جو اس وقت وہاں سرسید پر بڑی اتھارٹی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مراد آباد میں سرسید احمد خان کو بہت سکون تھا۔ ان کے پاس دو عہدے تھے یعنی صدر الصدوری اور اسپیشل کمیشن میں شمولیت۔ نیز ان کی سسرال بھی یہاں تھی۔ ان کے اپنے بچوں کے علاوہ ان کا بھتیجا بھی ان کے پاس رہتا تھا۔ یہاں ان کو معاشی خوشحالی بھی حاصل تھی۔

سرسید نے ۱۸۵۹ء میں مراد آباد میں ہی ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ اس سے قبل جدید انگریزی نوعیت کی کوئی اور درس گاہ مراد آباد میں قائم نہ تھی۔ ہاں البتہ مقامی مکاتب، چھوٹے مدارس و مساجد وغیرہ ضرور تھے جہاں تعلیم دی جاتی تھی۔ اگرچہ سرسید کا قائم کردہ مدرسہ فارسی زبان کے حوالے سے تھا لیکن اس کا طرزِ تعلیم انگریزی تھا۔ چند روز یہ مدرسہ بدستور چلتا رہا۔ جب اسٹریچی صاحب مراد آباد کلکٹر بن کر آئے تو انھوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا۔ چناں چہ فارسی مدرسے کے تمام طلبہ اس میں داخل کر دیئے گئے۔(۷)

مراد آباد میں ہی سرسید نے ہندوستانیوں کے لیے انگریزی زبان کی اہمیت پر غور کرنا شروع کیا اور اس حوالے سے ایک رائے بھی شایع کی۔(۸)

۱۸۶۰ء میں مراد آباد میں زبردست قحط پڑا۔ یہ قحط پورے شمالی ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اس قحط میں ضلع مراد آباد کا انتظام سرسید احمد خان کے سپرد کیا گیا۔ سرسید اور ان کی بیوی اپنے گھر کے آگے باقاعدہ قحط زدہ لوگوں میں لنگر تقسیم کرتے۔ اس غرض سے ایک محتاج خانہ بھی قائم کیا گیا جہاں پر چودہ ہزار محتاجوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ یاد رہے کہ سرسید کی مناجات (جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) میں لوگوں کی تعداد بھی پندرہ ہزار تھی۔ اسی دوران سرسید نے قحط سے متاثرہ لاوارثوں کے حوالے سے انگریزوں سے یہ وعدہ لیا کہ مسلمان لاوارث بچے مسلمانوں اور ہندو لاوارث بچے ہندوؤں کو سپرد کیے جائیں گے۔ عیسائی مشنریوں کو ان بچوں کو لینے کی اجازت نہ دی گئی تاکہ ان کو عیسائی نہ بنا لیا جائے۔ سرسید کا یہ قدم بھی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم لاوارثین کو تبدیل مذہب سے محفوظ رکھا۔ جہاں تک ''قحط کا تعلق ہے تو یہ یا تو جنگ کا فطری نتیجہ تھا یا انگریزوں کا خود ساختہ تھا۔ کیوں کہ جتنا راشن و خوراک قحط زدہ لوگوں کو سرسید کے محتاج خانے سے ملتی تھی۔ اگر انگریزوں کا انتظام درست ہوتا تو وہ خوراک ذخیروں سے نکل کر عوام تک پہلے کی طرح باقاعدہ پہنچتی رہتی۔ اس قحط کو خود ساختہ کہنے کے

علاوہ انگریزوں کی سیاسی و معاشی چال بھی کہا جا سکتا ہے۔

مراد آباد میں سرسید کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جب سرسید صدر الصدور تھے تو جج کے ایک ہندو کلرک کو ان سے عناد تھا اور وہ اکثر گم نام عرضیاں سرسید کے خلاف انگریزوں کو ارسال کرتا تھا۔ ایک عرضی میں اس نے لکھ دیا کہ سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خان نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور اس کی لاش ان کے گھر میں موجود ہے فوراً تلاشی لی جائے۔ اس وقت پولیس ان کے گھر پہنچ گئی اور تلاشی لی گئی۔ سرسید کو اس کا بہت دکھ ہوا۔ کیوں کہ عرض جھوٹی تھی اور مدعی بھی ہمراہ نہ تھا۔ ان کے گھر سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ آخر کار کوتوال مراد آباد کو برطرف کر دیا گیا۔[9]

مراد آباد میں بطور صدر الصدور سرسید نے مشہور درگاہ بغیہ شریف کے ایک مقدمے کا بھی فیصلہ کیا۔ اس مقدمہ کے سلسلے میں ۱۸۶۳ء تک کئی بار آپ کی حضرت عبدالرحیم شاہ مراد آبادی سے بھی ملاقات ہوئی۔[10]

مراد آباد میں ہی ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بیگم انتقال ہو گیا اور انھوں نے دو بیٹے سید حامد، سید محمود اور ایک کم سن لڑکی چھوڑی۔ اس کی قبر کے حوالے سے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔

مراد آباد میں سرسید کے قیام کے دوران ان کے دوست بھی تھے اور مخالف بھی بنے۔ ان کے دوستوں میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔[11]

(۱) محمد سعید خان

(۲) مولوی مظہر اللہ (پانی پتی)[12]

(۳) سید ظہور حسین مراد آبادی[13]

(۴) نواب مشتاق حسین وقار الملک

ان کے تذکرے الگ آئے ہیں۔ ان سے ملنے سرسید کئی بار مراد آباد جاتے رہتے تھے اور ان کو اپنے پاس بلوا بھی لیتے تھے۔ یہاں کے خاص دوستوں میں سے تھے۔

ان کے مخالفین میں مراد آباد کے کئی علما تھے جو ان کے خلاف کفر کے فتوے جاری کر چکے تھے۔[14]

مفتی سعد اللہ مراد آبادی ثم رام پوری نے ان کی تکفیر اور قتل کا فتویٰ دیا تھا۔[15] مراد آباد سے ایک اخبار ''لوحِ محفوظ'' نامی سرسید کے عقائد کی تکفیر میں نکالا گیا۔[16] مولوی محمد علی مراد آبادی بچھراؤں کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے سرسید کی تصانیف مذہبی کی رد میں کئی ترکیب و رسائل تحریر کیے۔ مولانا نعیم الدین مراد آبادی بھی سرسید کی تحریرات اور عقائد کے مخالف رہے ہیں گو کہ آپ ان کے مراد آباد سے جانے کے کئی برس بعد پیدا ہوئے۔

سرسید کے مخالفین کی زیادہ تعداد مذہبی تھی۔ چوں کہ اس دوران میں ہندوستانی سیاسی آزادی کے حامل نہ تھے۔ لہٰذا مراد آباد میں سیاسی آزادی نہ تھی۔ لوگوں پر خوف و ہراس تھا لہٰذا مراد آباد میں سرسید کا سیاسی مخالف ہونے کے باوجود کوئی

سامنے نہ آیا۔

حواشی

(۱) مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، (آگرہ: مطبع مفیدِ عام، ۱۹۰۳ء)، ص ۸۸۔۸۹

(۲) سرسیّد احمد خان، آثار الصنادید، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۲۰۱۲ء)، ص ۱

(۳) مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۸۹

(۴) ایضاً، حیاتِ جاوید، ص ۸۸

(۵) ایضاً، ص ۱۰۴۔۵

(۶) ایضاً، ص ۸۶۔۹۷

(۷) ایضاً، ص ۹۱

(۸) ایضاً، ص ۹۱۔۹۳

(۹) ایضاً، ص ۷۵۳

(۱۰) مقدمہ نمبر بعنوان ۵۴۵، سال ۱۸۶۰ء

(۱۱) مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، محولۂ بالا، ص ۷۴۶ و مکتوباتِ سرسید، مرتب: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۶ء)، ص ۴۵۔۵۹

(۱۲) سرسیّد احمد خاں، مکتوباتِ سرسیّد، ایضاً، ص ۹۰۔۹۴

(۱۳) ایضاً، ص ۳۳۴۔۴۴

(۱۴) ایضاً، ص ۵۵۲

(۱۵) ایضاً، ص ۵۵۱۔۵۵۲

(۱۶) ایضاً، ص ۵۴۵

مآخذ

(۳) پانی پتی، شیخ محمد اسماعیل، (مرتب)، مکتوباتِ سرسیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۶ء

(۱) حالی، مولانا الطاف حسین، حیاتِ جاوید، آگرہ: مطبع مفیدِ عام، ۱۹۰۳ء

(۲) خان، سرسیّد احمد، آثار الصنادید، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۲۰۱۲ء